HARF-O-SUKHAN Urdu Research Journal of PAKISTAN
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

"چاند کو گُل کریں تو ہم جانیں" میں سماجی، عصری، تاریخی حقائق کی بازیافت

RETRIEVAL OF SOCIAL, CONTEMPORARY, HISTORICAL FACTS IN "CHAND KO GUL KRAIN TO HUM JAANEN"

Dr. Muhammad Kamran Shahzad,
Visiting Lecturer Department of Urdu University of Sargodha
, kamranshehzadranjha786@gmail.com
Dr.Nazia Sahar ,
Department of Urdu , Islamia College Peshawar
Tariq Bin Umar ,
Department of Urdu , Shah Abdul Latif University Khairpoor

Abstract:

Language is the best means of expression and the process of transferring the meaning of any language to another language is called the art of translation. While translating, the translator must be familiar with the structure, linguistic structure, grammar, local dialects and culture of the other language, because literature is being created in many languages spoken in the world, which the translators of each region can use in their own local language. By translating into the language, the text is made readable for the general reader. There is a long list of best translations of novels and legends in Urdu literature, especially fiction. Among the translations that came out in the 21st century is the translated novel of "Asim Bakshi" titled "Chand KO Gul Krain to Hum Jaane" which is a translation of the English novel "Snuffing out the moon". While translating, Auther has sh own the image of the poor and helpless people in front of the capitalist system in the world, considering the historical aspects and social, contemporary of the novel.

Key Words: "Chand KO Gul Krain to Hum Jaane" Urdu Novel, Historical facts, Social, contemporary

انسان جس عہد میں بھی جنم لیتا ہے وہ دنیا کی تاریخ میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ اپنے خطے کے ماضی کے ساتھ بھی جڑتا ہے کیونکہ ہر خطے کے فرد کے سامنے سیاسی، سماجی ،معاشرتی، ثقافتی رونما ہونے والی تبدیلیوں کے سبب سوالات اٹھاتے ہیں، جن کا جواب اسے ماضی بعید اور تاریخی گوشوں سے ہی ملتا ہے، جس کے لیے وہ ماضی میں پلٹ کر تاریخ کے اوراق کو پلٹتا ہے تو اسے اپنے خطے کے حالات وواقعات اور سانحات سے آگاہی ملتی ہے علاوازیں کبھی تو انسان اپنا معیار زندگی بہتر کرنے کے جتن کرتا، کبھی طاقت اور جبر کے خلاف اپنے حقوق کے لیے مزاحمتی انداز اپناتا، کبھی اپنے عہد کی سیاسی، سماجی، معاشرتی اور ثقافتی پابندیوں میں جکڑا نظر آتا ہے۔ ہر عہد کا مورخ معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں کے ساتھ ساتھ سیاسی واقعات کو ترتیب وار تحریر کرتا ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ بیشتر تاریخ نویسوں کی تاریخ سیاسی دباؤ میں مکمل ہوئی، جس کے باعث بیشتر تواریخ میں مورخ کی پسند ناپسند شامل بھی ہوتی ہے اس لیے ایک عہد میں لکھی گئی تواریخ میں تضاد پایا جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال واقعہ کربلا ہے، جس کی ہر عہد کے مختلف مکتب فکر کے مورخین نے اپنے انداز میں تشریح کی ہے۔(1) اگر مورخین قرآن و حدیث اور تاریخ میں اسلامی واقعات پر قلم فرسائی کریں تو قاری کے سامنے اسلام کی مبادیات کے ساتھ ساتھ نبی کریم اور صحابہ کرام کے معمولات زندگی کے متعلق صحیح معلومات فراہم کرتے ہیں۔ گویا کسی بھی عہد کی تاریخ لکھنے کا مقصد اس دور کے حالات وواقعات کے ساتھ اس دور کے انسان اور عصر حاضر کے انسان کا موازنہ کرنا ہوتا ہے علاوہ ازیں تاریخ ایک طرف سماجی شعور کا مجموعہ ہوتی ہے، جس کے باعث قومیں اپنی خامیوں کی نشان دہی کرتی ہیں تو دوسری طرف مستقبل کی راہیں متعین کرتی ہے۔

ہر عہد کے مورخین مخصوص اصول وضوابط کو مد نظر رکھتے ہوئے تاریخ مرتب کرتے ہیں لیکن فکشن نگار معاشرتی حساسیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اسی تاریخ کو اپنی تخیلاتی فضا سے کرداروں کی مدد سے کہانی کو اس انداز میں پیش کرتا ہے جیسے واقعات مبنی بر حقیقت ہیں، اس سے قارئین میں تاریخ کا مطالعہ کرتے دلچسپی کا عنصر بھی برقرار رہتا ہے۔ ڈاکٹر ابو للیث صدیقی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

"ناول میں خصوصاً تاریخی ناول میں نام چاہے حقیقی ہوں، داستان، معاملات، مناظر سب ناول نگار کے تخیل کی پیداوار ہوتے ہیں اور حقیقت سے ان کا تعلق برائے نام ہی ہوتا ہے اس لیے یہاں اس کی نقل نہیں ایجاد اور تخلیق پر زور ہوتا ہے اس طرح تاریخی ناول میں سے چند نام تاریخی ہوتے ہیں اور بس ! ہاں ان کو تاریخی ناول اس اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ ناول نگار تاریخ کا ایک شعور رکھتا ہے اور بعض تاریخی کرداروں یا واقعات کو اپنے ناولوں میں بطور پس منظر استعمال کر سکتا ہے" (2)

اُردو میں تاریخی واقعات کو بنیاد بنا کر لکھے گئے ناولوں کی طویل فہرست ہے، جن میں عبدالحلیم شرر، احسن فاروقی، قرۃالعین حیدر، جمیلہ ہاشمی اور فہمیدہ ریاض کے ناول تاریخی اعتبار سے سرفہرست ہیں لیکن ان ناولوں میں تاریخی واقعات کو حقیقی یا غیر حقیقی کرداروں کی مدد سے ناول نگاروں نے اپنے تخیل کی کارفرمائی کے ذریعے تحریر کیا ہے۔ اکیسویں صدی میں اسامہ صدیق انگریزی ناول نگار ہیں جنھوں نے اپنے اولین ناول Snuffing Out the Moon میں تاریخ و تہذیب کے ساتھ ساتھ مستقبل کے متعلق انسانی خلفشار اور انسانی بے قدری کا بیان کیا ہے۔ یہ ناول ہندوستان سے Penguin Random House India نے 2017ء میں شائع کیا اور ناول کا پیپر ایڈیشن 2020ء میں چھپا۔ ناول کے شائع ہوتے ہی ادبی حلقوں اور معاصر فکشن نگاروں کی طرف سے خوب پذیرائی ملی کیونکہ ناول اپنے منفرد تاریخی موضوع اور تکنیک کے حوالے سے انفرادیت رکھتا تھا۔ جس کا ثبوت ہمیں انگریزی ناول پر لکھے جانے معاصرین کے جاندار تبصروں سے ملتا ہے۔ چونکہ یہ ناول پاکستانی انگریزی ناول نگار کے قلم کا نتیجہ تھا تو ضرورت اس امر کی تھی کہ ناول کو مقامی زبان میں ترجمہ کیا جائے تاکہ عام قاری کو بھی تاریخی ناول پڑھنے کو دستیاب ہو۔ چونکہ ترجمہ ایک دقیع کام ہے اس لیے انگریزی اور اُردو پر عبور رکھنے والا ہی ترجمہ کر سکتا تھا۔ لہذا یہ کٹھن کام عاصم بخشی نے ذمہ لیا اور اایسا رواں اور چست ترجمہ کیا کہ ترجمہ شدہ ناول ہی تخلیقیت سے بھرپور لگتا ہے۔ عاصم بخشی نے ناول کا ترجمہ بعنوان "چاند کو گل کریں تو ہم جانیں" کیا، جس کو 2021ء میں بک کارنر شوروم جہلم نے بڑے اہتمام سے شایع کیا۔ اس ناول کے ابتدائی صفحات پر معاصرین فکشن نگار اور ناقدین کی انگریزی آرا کا اُردو ترجمہ بھی شامل ہے، جو اس ترجمے کی اہمیت کو بڑھا دیتا ہے ان میں سے چند معاصرین کی رائے ملاحظہ کیجیے:

"اسامہ صدیق کا ناول "چاند کو گل کریں تو ہم جانیں" پڑھتے ہوئے میں اس سراب کا شکار ہوا کہ وقت ٹھہر چکا ہے اور یہ اسامہ صدیق ہے، جو اس میں سے گزرتا جاتا ہے۔ ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کی جانب ایک کھوجی کی مانند سفر کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کی تخلیقی قوت وقت کے نقش پا کو دریافت کرنے کبھی تو الٹے قدموں ماضی میں چلی جاتی ہے اور کبھی مستقبل کی جانب جاتی ہے" (مستنصر حسین تارڑ)

"یہ ناول اس خطے پہ گزری زندگی کو دوبارہ جینے کی کوشش ہے جو اسامہ صدیق اپنے جذباتی ،حسیاتی اور تصوراتی آہنگ میں جینا چاہتا ہے۔ کسی بھی تخلیق کار کے لیے اس طرح کا تجربہ تمام تر انسانی امکانات کے رچاؤ سے سرشار ہوتا ہے" (اصغر ندیم سید)

"انسانی سعی و انکار میں یقین سے پیدا ہونے والی امید کی جو کرن فیض صاحب کی نظم 'زندان کی ایک شام' کی آخری سطر میں ہے۔ وہ اس پورے ناول میں دکھائے گئے بعید ترین اور تاریک ترزمانوں میں لرزتی، چمکتی دکھائی دیتی ہے" (ناصر عباس نیر)

"انگریزی میں لکھے اس ناول کا اُردو ترجمہ از خود تخلیقیت سے بھرپور ہے کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ بھی رہا ہو گا۔ اس ایک ناول نے قاری کو وہ کچھ دیا، جو ماضی حال کی تاریخیں، آثار قدیمہ سیاسیات، معاشریات، تہذیب وثقافت اور کئی علوم پر لکھی ڈھیروں ڈھیر کتابوں کے مطالعہ کے بعد بھی شاید حاصل نہ ہو سکتا" (طاہرہ اقبال)

"اسامہ صدیق کا انگریزی ناول "Snuffing Out the Moon" تاریخ و تہذیب میں انسان کی عقل و دانش طاقت و اختیار اور فرد کی وجودیت کے باہمی خلفشار سے جنم لینے والی ایک جرات مندانہ تخیلاتی تخلیق ہونے کے علاوہ گزشتہ دو دہائیوں میں پاکستانی ناول کے اس ساختیاتی اور مظہریاتی ارتقاء کی ایک اہم کڑی بھی ہے، جو بالعموم اردو ناول میں دیکھنے میں آئی" (مرزا اطہر بیگ)

"ماضی کی گرد سے مستقبل کی دُھندتک، زندگی، موت، طاقت، جبر اور مزاحمت کے فلسفے سے بھرپور اسامہ صدیق کا یہ ایک ایسا منفرد اور شاندار ناول ہے، جو اپنے وسیع کینوس میں کئی زمانوں اور تہذیبوں کا اسرار بھرا خزانہ سمیٹے ہوئے ہے" (حنا جمشید)

ناول کے اُردو ترجمے کا عنوان "چاند کو گل کریں تو ہم جانیں" فیض احمد فیض کی نظم "زندان کی ایک شام" کے آخری مصرعے سے لیا ہے۔ جیسا کہ فیض نے اپنی نظم میں زندان کے دنوں کی تاریکی کو عیاں کرتے ہوئے کہا کہ ظلم و جبر کے دور کے بعد بھی روشنی کی کرن کی امید رہتی ہے۔ ایسے ہی ناول کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر عہد میں ظلم اور جبر جتنا بھی بڑھ جائے، انسان کو امید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ لہذا مصنف نے ناول کے موضوع کے مطابق عنوان منتخب کیا ہے یعنی کہ چاند کو کبھی گل نہیں کیا جا سکتا اس کی خاصیت ہی چمکنا ہے۔

نظم کے آخری چند مصرعے ملاحظہ کیجیے:

دل سے پیہم خیال کہتا ہے

اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گُل کریں تو ہم جانیں(3)

480صفحات پر مشتمل ناول پانچ حصوں میں منقسم ہے، جن کے عنوان بالترتیب" کتابِ سراب، کتابِ شگون، کتابِ سوز، کتابِ نفرت اور کتابِ نفرت"ہیں لیکن ہر حصہ کو الگ پڑھا جائے تو ہر قصہ اپنے عہد کی نمائندگی کرتے ہوئے الگ ناول بن سکتا ہے۔ان پانچ حصوں میں ماضی، حال اور مستقبل کی چھ تہذیبوں کے زوال اور زندگی کی راہوں کو ازسرِ نو تشکیل کو اس انداز میں بیانیے کا حصہ بنایا ہے کہ ناول تہذیبوں کی تاریخ کے ساتھ سماجی و معاشرتی، معاشی اور ثقافتی تبدیلیوں کا عکس عیاں ہوتا ہے۔ناول کی کہانی وادی سندھ کی تہذیب 2084 قبل مسیح سے لے کر 2084ء تک پانچ ہزار برسوں تک محیط ہے۔ان چھ قصوں میں ناول نگار نے اپنی فنی پختگی اور تخیلاتی فضا سے ماضی، حال اور مستقبل کے تاریک زمانوں کو ہنستی، مسکراتی زندگی سے جوڑ کر فکشن کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ناول متنوع موضوعات کا حامل ہے۔ کہیں تو تہذیبوں کے زوال کی داستان سنا رہا ہے، کہیں ظالم اور جابر اشرافیہ اور حکمرانوں کی نا اہلی کے ساتھ سماج میں ہونے والی ناانصافیوں کی تصویر کشی کر رہا ہے۔ کہیں بے کس، غریب اور مسکین افراد کو اپنی بقا کی جنگ کے لیے اشرافیہ اور ان کی پالیسیوں کے خلاف مزاحمتی رنگ نظر آتا ہے اور یہی موضوع ہر قصے میں مشترک ہے۔

ناول کی ابتدا موہنجوداڑو، وادی سندھ کی تہذیب(2084 قبل مسیح) کے قصے سے ہوتی ہے۔اس سے قبل متعدد ناول نگاروں مثلاً مستنصر حسین تارڑ، طاہرہ اقبال اور حنا جمشید کے ناولوں وادی سندھ کی تہذیب کو بطور موضوع سخن بنایا گیا لیکن ان میں سندھ کی معدوم ہوتی تہذیب، تاریخ، کلچر اور عصرِ حاضر میں تہذیبی نقوش کا بیان ہے مگر اسامہ صدیق نے انسانی تاریخ کے ارتقائی مراحل میں طاقت ور، جابر اور ظالم اشرافیہ کے سامنے بے بس عوام کا معیارِ زندگی کا عکس دکھایا ہے اس لحاظ سے یہ ناول انفرادیت رکھتا ہے۔اس ابتدائی قصے میں "پرکا" اور "موتلا" دو مزاحمتی کردار تشکیل کیے ہیں۔"پرکا" کاروباری مراکز کا خوب صورت شہر "شہر خشت" سے باہر جنگل میں درختوں پر زیست گزارتا ہے جبکہ موتلا شہر میں موجود حماموں کا منتظم تھا اور شہر کی روحانی اور ثقافتی زندگی کو دیکھتا تھا۔شہر کے یہ باشعور کردار شہر کے راج پروہت سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ وہ نسل در نسل حاکمیت کے قائل ہیں اور اصلاح، خیراتی نظام اور رسم و رواج کی آڑ میں اور انسانیت کے لبادے میں کاروبار کر رہے، جس کا تمام منافع اپنی تجوریوں میں بھرتے ہیں۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"حکمران بیٹھ کر خالی خولی تماشہ دیکھتے ہیں جبکہ پروہت طاقت پکڑ چکے ہیں بلکہ پروہت اب بیوپاری بن چکے ہیں۔ پیچیدہ خیراتی نظام، رسم رواج کے بے انتہا سلسلوں اور چھوٹے موٹے معجزوں کے مقدس پردے کے پیچھے ان کے اصل ارادے اور پھلتی پھولتی طاقت ہے۔"(4)

انسانی تاریخ کے ارتقائی مراحل سے ہی دنیا کے وسائل پر طاقت ور اور حکمران طبقہ قابض ہے، جس کے سبب عام فرد نا صرف بھوک سے نڈھال ہے بلکہ وہ بنیادی ضروریات زندگی سے محروم ہے اور اپنی زندگی اور بچوں کی بقا کے لیے کبھی تو طاقتور کی غلامی قبول کر لیتا ہے اور کبھی اپنی بساط کے مطابق ناکام مزاحمت کرتا ہے۔ مصنف نے ایسے طاقت ور افراد کے لیے بھیڑیوں کو لفظ بطور علامت استعمال کیا ہے۔ جیسے بھیڑیے اپنے شکار کو چیر پھاڑ دیتے ہیں ایسے ہی اشرافیہ بھی دولت اور اقتدار کے راستے میں ہر آنے والے کو کچل دیتے ہیں اور انھیں کسی قسم خوفِ خدا اور ڈر نہیں ہوتا ہے۔

انسانی تخلیق کے بعد انسان کے ذہن میں متعدد سوالات جنم لیتے تھے کہ ہمارے آباؤ اجداد کہاں گے؟ موت کا فلسفہ کیا ہے؟ انسان ابدی نیند کیوں سو جاتے ہیں؟ شر کیا ہے؟ خیر کیا ہے؟ ان سوالات کے جوابات ناپید تھے لیکن مذہب کی ظہور سے ان سوالات کے جوابات کی راہ نکلی تھی اور مذہب نے انسان کو اس کی شناخت بتائی، تخلیق کا مقصد بتایا لیکن ہر عہد میں طاقت ور طبقہ اپنی کمزور ہوتے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے مذہب کو آلہ کار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ناول میں جب راج پروہت کا خوف ختم ہونے لگا تو مذہب کے لیے راستہ ہموار کیا گیا اور مذہبی تہواروں کی تفصیلات وضع کی گئی اس کے لیے سالانہ کیلنڈر ترتیب دیا گیا اور لوگوں کو ترغیب دی گئی کہ اپنے کسی بھی ذاتی فعل کو مقدس کلمات سے جوڑ کر وظائف اور تعویذ گنڈے کرنے ہیں۔ ہر عہد کا بڑا المیہ یہ رہا کہ مذہب کے ٹھیکے دار بھی مذہب کے لبادے میں ہر کام میں شریک جرم ہوتے ہیں اور انھیں پوچھنے والا کوئی نہیں جیسا کہ ناول کی چند سطور میں بیان کیا گیا ہے

"نئے مذہب کے ٹھیکے داروں نے یہی سوچا کہ نہ صرف روحانی دائرے بلکہ ریاست و سیاست، تجارت، یہاں تک کہ لوگوں کی ذاتی زندگیوں میں بھی اپنا اثر و رسوخ قائم کریں۔ اور تھا ہی کون جو ان پر اعتراض کرتا۔"(5)

ہمیشہ غریب اور بے کس عام افراد اپنے مستقبل کے متعلق فکر مند رہتے ہیں جبکہ حکمران طبقے کا مستقبل محفوظ ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ ناول نگار نے شہر خشت میں بارشوں اور سیلاب کو بھی بطور علامت استعمال کیا ہے کہ جس طرح راج پروہت شہر خشت میں دونوں ہاتھوں سے دولت اور طاقت کو بڑھا رہے ہیں۔ اگر عام آدمی ان کے خلاف یا اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے اقدام نہیں کریں گئے تو اپنا ہی گھر آگ میں جل کر راکھ ہو جائے گا۔ اور تاریخ کے اوراق میں سیاہ باب میں لکھا جائے گا کہ اپنے حقوق کے لیے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تھے۔

اس حصے کے اختتام پر 'پر کا' کا شہر خشت " کے نہ بدلتے حالات کے پیش نظر کئی اور شہر ہجرت کرنا زندگی کو از سرِ نو گزارنے کے مترادف ہے یعنی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے نئے سے نئے راستوں کی تلاش میں چل نکلا ہے۔

ناول کا دوسرا حصہ تکشا سیلا، گندھارا کی راجدھانی (455ء کے لگ بھگ) کے عنوان سے ہے، جو سکندر اعظم کے قدیم شہر ٹیکسلا میں گندھارا تہذیب کی کہانی ہے۔ اس حصے میں بدھ متر کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے، جو سماج میں امن کا نمائندہ ہے اور اپنے دل میں امن کے دیے جلائے قریب سبز پہاڑی پر گم رہتا ہے۔ اس حصے کی ابتدا میں بدھ مت کی عظیم درسگاہ میں داخل ہونے والے کو کسی بھی لڑکے کو گرو کا پ چیلا بننا پڑتا ہے اور تعلیم کے اختتام پر تعظیم و تشکر کا نذرانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ بدھ متر پہاڑی پر اپنے من میں گم تھا کہ اس کا گرو بھگشو خبر دار کرتا ہے کہ دھرتی کا امن تباہ کرنے کے لیے "مارا" کی آمد ہونے والی ہے تو بدھ متر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کائنات میں بے اختیار انسان سماج کا امن نیست و نابود کرنے پر بضد ہیں۔ یہاں مصنف نے "مارا" کے کردار کو سفاک انسانوں کے لیے بطور علامت تخلیق کیا ہے، جو کسی بھی تہذیب کی تباہی کا سبب بنتے ہیں۔ دوسری طرف بدھ متر کا ماننا یہ ہے کہ کائنات میں اللہ کے سوا کسی کو بقا نہیں ہے اور ہم سے پہلے کتنی ہی قومیں ملیامیٹ ہو گئی کسی کا نام و نشان نہیں ہے۔ گویا مصنف نے اس حصے میں بھی طاقت ور اور کمزور کے مابین کشمکش کا عکس دیکھایا ہے۔

اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ہم سے بہت پہلے یہ وادی ہمارے سُتروں کے الاپ سے نہیں بلکہ برہمنوں کے گائے ویدوں کے بھجنوں سے گو بجتی تھی، پھر اس سے بھی بہت پہلے یہاں ان لوگوں کی آوازیں آتی تھیں، جو دور پچھم سے آئے تھے اور ایک ایسی بھاشا بولتے تھے جس کا اتا پتا مٹ چکا ہے۔ کتنی ہی راجدھانیاں آئیں اور گئیں۔ کسی کا کچھ نہیں بچا سوائے یہاں کوئی پتھر کی سہار تو وہاں کوئی پرانی ڈھلائی اور اس ٹیلے کے نیچے مٹی کی تہوں میں وبا کسی برتن کا ٹکڑا۔ سمے کا پہیہ یونہی گھومتا ہے (6)"

ناول کے اس حصے کی انفرادیت یہ ہے کہ قدیم عہد کو مد نظر رکھتے ہوئے تاریخی الفاظ کا انتخاب، اسلوب اور بیانیے کو فکشن کے ڈکشن میں منفرد انداز میں ڈھالا ہے۔ گویا ناول کا یہ حصہ مصنف کی گہری فکر، عمیق مطالعے اور انسانی تاریخ کے بسیط شعور کا مظہر ہے۔(7)

ناول کا تیسرا حصہ 1620ء کے لگ بھگ مغل بادشاہ جہانگیر کے زمانے پر محیط ہے۔ اس حصے میں سکندرِ ثانی اور مرزا فراستہ نامی دو ٹھگ تشکیل کیے ہیں، جو چھوٹی موٹی چوریاں اور ہیرا پھیریوں کے ذریعے امراسے اپنا حق چھینا چاہتے ہیں۔ محنت کے بجائے قسمت پر یقین رکھتے ہیں لیکن قسمت انھیں ایک ایسے گرداب میں پھنسا دیتی ہے، جس سے نکلنے کی ہر چال الٹی پڑ جاتی ہے۔ اسی دوران قدرت مغلیہ دربار میں انھیں قوت، طاقت اور جبر کے استبداد کے مختلف پہلوؤں کا نظارہ کراتی ہے۔ مثلاً جب یہ دونوں قسمت آزمانے پرویز دنیادار کے ہمراہ قلعہ لاہور کی دیو ہیکل دیواروں کے اندر پہنچنے کے لیے لاہور کی جانب سفر کرتے ہیں تو لاہور داخلے کے وقت کوتوال کے زیر عتاب آجاتے ہیں اور دوسرا پرویز دنیادار انھیں کلائیوں سے مضبوطی سے پکڑ کر بڑے میدان میں لے جاتا ہے جہاں بادشاہ کے دربار میں روز عدل کے مناظر دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ مصنف نے بڑی باریک بینی سے تاریخی مناظر کی عکس بندی کی ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے :

> " جلد ہی بھید کھل گیا: یہ شہنشاہ کا روزِ عدل تھا۔ وہی دن جب نوعِ انسانی اور سلطنت کے خلاف مختلف نوعیت کے بدترین جرائم کا ارتکاب کرنے والے اپنے خالق سے جاملتے تھے۔ کبھی کبھار تو فوراً ہی اور کبھی کبھار درد و اذیت کے ایک طویل دور کے بعد۔" (8)

مصنف نے اس حصے میں میں ہندوستانی عوام کی نظروں میں عزت و تکریم پانے والے درویش باباوں کی خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ تنہائی پسند اور اپنے من میں ڈوبے رہتے ہیں۔ دنیا سے اور کسی کی ذاتی زندگی سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے۔ ایسے افراد من موہن سے کم نہیں ہوتے ہیں۔ سکندرِ ثانی کو مرزا فراستہ نے مشورہ دیا کہ میں من موہن جیسی خوبیوں کا مالک بن کر شہنشاہ کے قلعے کے قریب باغ میں جا کر عبادت کے لیے راتیں بسر کروں گا، درویش ہونے کے ناطے ہمیں کوئی شک کی نگاہ سے نہیں دیکھے گا لیکن سکندرِ ثانی خبر دار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کوئی بادشاہ ایسا نہیں گزرا، جو ظالم اور جابر نہ ہو۔ اگر بادشاہ کو ذرا سا بھی شک ہوا تو ہمارا انجام اچھا نہیں ہو گا۔ حقیقت میں ناول نگار اس دور کے بادشاہوں کا مزاج قاری کے سامنے عیاں کرنا چاہ رہا ہے کہ اگر کوئی واقعی ہی درویش یا ضرورت مند ان کے دربار سے منسلک ہو جاتا ہے تو وہ رقیق القلبی کی بہترین مثال بھی ہوتے ہیں، جیسے کہ مرزا فراستہ جب من موہن بن کر باغ میں عبادت کرتا ہے تو بارش میں بھیگنے کے باعث بیمار ہو جاتا ہے تو بادشاہ نہ صرف فکر مند ہوتا ہے بلکہ علاج کے لیے حکیم کو بھی بھجواتا ہے لیکن بادشاہ کے

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

سامنے حقیقت کھلتی ہے تو وہی بادشاہ کا عتاب عروج پر ہوتا ہے۔ مرزا فراستہ اپنا بھیانک انجام کو دیکھتے ہوئے طوطی خان کے ذریعے بھاگنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن سکندر ثانی کو پھانسی کا حکم دے دیتا ہے۔ پھانسی کو جس دلیری اور بہادری کے ساتھ اس نے گلے لگایا اس کی دلیری دیکھ کر کوتوال ہیبت خان بھی متاثر ہوا کہ آزادی کے متلاشی کو آزادی کی خاطر ایسی کہیں زندگیاں قربان کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔(9)

عمومی طور پر مغل بادشاہ جہانگیر کے متعلق یہ روایت ہے کہ رحم دل اور انسانیت کا درد رکھنے والا حکمران تھا اور اپنے عہد میں صوفیا کرام، درویشوں کے لیے راہ ہموار کی تھی لیکن اس حصے کے اختتام میں پھانسی کے مناظر اس کے ظلم اور بربریت کا عکس عیاں ہے۔

ناول کا چوتھا حصہ 1857ء کے لگ بھگ کا ہے، جس میں فاتح نو آبادیات اپنے راستے کے تمام کانٹے صاف کرتے ہوئے اس خطے پر قابض ہوتے ہیں، جسے وہ سونے کی چڑیا کہتے تھے۔ انگریزوں نے سب سے پہلے خطے کی دو بڑی قوموں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مذہبی بنیادوں پر اختلافات پیدا کیے، اسی مذہبی اختلاف کے باعث جنگ آزادی کا آغاز ہوا تھا علاوہ ازیں اپنے مقامی جاسوسوں کی مدد سے ہر اس شخص پر ظلم اور جبر کی مثال قائم کر دیتے تھے، جو بھی برطانوی سامراج کے خلاف مزاحمت کرتا تھا۔

ناول نگار نے اس حصے میں انگریزوں کا مکروہ چہرہ عیاں کیا ہے کہ وہ مقامی افراد میں اپنی شناخت بنانے کے لیے کئی حربے اختیار کرتے تھے۔ مثلاً وہ اس سیاسی و سماجی ڈھانچے کی کبھی حمایت نہیں کرتے تھے، جو مقامی حکمرانوں کی استبدادی روایت کا امین ہوتا تھا۔ وہ بظاہر اصلاح اور شرافت کی بات کرتے تھے۔ سڑکیں، ریلوے لائن، شاندار عمارتیں اور نہری نظام کو بھی متعارف کروا کر عوامی مقبولیت حاصل کی لیکن سکے کا دوسرا رخ دیکھیں تو وہ زمین کی پیداوار کا زیادہ منافع لے جاتے اور تجارت کے بھیس میں لوٹ مار کرتے تھے اور جو بھی اس لوٹ مار کی راہ میں حائل ہو کر مزاحمت کرتا اس سے غیر انسانی سلوک برتا جاتا تھا گویا ان کے ظاہر و باطن میں تضاد کھل کر عیاں تھا۔ اس قصے میں داستان گو میر کا کردار نمایاں ہے، جو اپنے ہم وطن بھائیوں کو خبر دار کر رہے ہیں کہ آپس میں اختلافات اور مقامی جاسوسوں کی غداری کے باعث یہ کشتی جلد ڈوبنے والی ہے اور اسے سورج غروب ہوتا نظر آرہا ہے۔(10)

اس حصے میں مقامی فوجیوں (مسلمان، ہندوؤں، سکھوں) کی فرنگیوں کے خلاف مزاحمت کا بیان مصنف کے عمیق مشاہدے کا مظہر ہے، جب ایک صبح انگریز حوالدار میجر نائیک دھنی رام کو مکا رسید کیا کہ وہ معائنے کے وقت گھور تا رہتا ہے، جس کے باعث دھنی رام بخار میں مبتلا ہو گیا۔ اس واقعہ نے مقامی فوجیوں جلتی پر آگ کا کام کیا اور دھنی رام کے منہ سے یہ بددعا نکلی:

> "تم کتے کی موت مروگے، فرنگی! سالوں میں نہیں، مہینوں میں نہیں، بلکہ بہت جلد۔ تمھاری سوچ سے بھی بہت پہلے۔ طوفان آچکا ہے اور بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں۔ ایک سکھ سپاہی نے اپنی رائفل اٹھائی اور اطمینان سے گرے ہوئے جوان کے سینے پر بٹ مارا جس کے نتیجے میں اسے شدید کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ خون تھوکنے لگا۔ 'ایسا نہیں چل سکتا! ہمیں مار ڈالو یا آزاد کر دو! نائیک خدا بخش چیخا۔" (11)

مقامی فوجیوں کی مزاحمت اور بغاوت کے نتیجے میں کئی انگریز جہنم واصل ہوئے لیکن اس کے نتیجے میں انگریزوں کا ان باغیوں کو سزا دینے کے دل خراش مناظر سے قاری نہ صرف افسردہ ہوا بلکہ انسانیت کا پرچار کرنے والے فرنگیوں کی اصلیت بھی کھلتی ہے، جب ایک انگریز یہ کہتا ہے کہ مقامی فوجی کی نعش کو گھسیٹ کر انارکلی لے جا کر دوبارہ ساری کارروائی کروں اور آخری پندرہ باغیوں کا انجام اس اقتباس سے عیاں ہوتا ہے۔

> "ایسی صبح کچھ عرصہ بعد، پندرہ پیچھے رہ جانے والے باغیوں کو توپوں کے منہ سے باندھ دیا گیا۔۔۔ موت کے گھاٹ اتارنے کا ایک ایسا طریقہ کار جو نہ صرف ڈرامائی بلکہ کافی بلند آواز اور چونکا دینے والا بھی تھا۔۔۔ اور مقامی لوگوں کے ایک بڑے مجمع کے سامنے میاں میر چھاؤنی کی پریڈ گراؤنڈ میں اڑا کر رکھ دیا گیا۔ آنے والے دنوں میں اور بہت سوں کا بھی یہی حشر ہوا۔" (12)

ناول کا پانچواں حصہ اکیسویں صدی کے لاہور (2009) میں عدالتی کارروائیوں اور مکار، نوسرباز وکیلوں کی منافقت اور شہریوں کی مال و جان کی حفاظت کرنے والے ریاستی اداروں پولیس کا عام لوگوں کے ساتھ رویے کا عکاس ہے۔ اس قصے میں غریب بیوہ رفعیہ بیگم انصاف کی طالب کبھی تو عدالتی کارروائی سے مایوس ہوتی ہے تو کبھی وکیلوں کا پیسے لے کر مقدمہ کی عدم پیروی کرنے پر۔

عمومی طور پر کہا جاتا ہے کہ جس ملک میں عدالتیں انصاف کرتی ہوں وہاں ایک تو جرائم کی شرح کم ہوتی ہے دوسرا پولیس عوام کی جان و مال کی حفاظت کرتی ہے، جس کے باعث عوام کا عدلیہ اور پولیس پر اعتماد ہوتا ہے۔ مصنف نے ایک عدالتی کیس کو بنیاد بنا کر پاکستانی ریاستی اداروں کی بھیانک تصویر دکھائی ہے

اسلام اور کلمہ کے نام پر بننے والے ملک میں قانون محض سراب ہے، ایک گورکھ دھندا ہے، جس کو ادارے جب چاہتے جیسے مرضی استعمال کرتے ہیں، جو غریب پر اپنی پوری آب و تاب سے لاگو ہوتا ہے جبکہ امیر کی جیب میں ہے، جو قانون کی ہر شق میں ردوبدل بھی اپنے فائدے کے لیے کر لیتے ہیں ۔ یہاں قاری کو اندازہ ہوتا ہے کہ ناول نگار صرف تاریخی شعور ہی نہیں رکھتا بلکہ عصر حاضر کے سماجی شعور پر بھی دسترس رکھتا ہے۔ بظاہر ہم دنیا میں ساتویں بڑی ایٹمی طاقت ہے لیکن ہماری عوام بنیادی ضروریات زندگی سے ہی محروم ہے ا۔ اس سے بڑا

حرفِ سخن
HARF-O-SUKHAN
Urdu Research Journal of PAKISTAN
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

المیہ یہ ہے کہ ملک کا کوئی ریاستی ادارہ سسٹم کو بہتر کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتا ہے۔ ہر جگہ اقربا پروری، رشوت، لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ اسی لیے مصنف نے موجودہ پاکستان کی منظر کشی کے لیے عدالتی نظام کو بنیاد بنایا، جہاں جج سے لے کر وکیل اور منشی سب کی قیمت لگتی ہے۔ اس اقتباس میں ملاحظہ کیجیے:

"رفیعہ بی بی، میں تمام قانونی دلائل تو دے دوں لیکن عدالتی کارندے کچھ اور دلائل بھی مانگتے ہیں۔ یہ اکساوا چاہتے ہیں۔ رغبت چاہتے ہیں۔ متواتر حوصلہ افزائی چاہتے ہیں ورنہ جلد ہی پتہ چلتا ہے کہ عدالتی کارروائی سست پڑھنے لگ گئی ہے یا بالکل ہی رک گئی ہے۔ کبھی مقدمے کی فائل غلطی سے گم ہو جاتی ہے۔ یا بارش میں بھیگ جاتی ہے۔ یا پھر کوئی ضروری دستاویز کوا لے اڑتا ہے۔ اگلی پیشی کی مناسب تاریخ نہیں ملتی۔ یا مقدمہ روز کی سو پیشیوں کی فہرست میں سب سے نیچے جا گرتا ہے۔" (13)

ناول کا آخری حصہ مستقبل 2084ء کے لگ بھگ کا ہے، جس کو پڑھتے ہوئے قاری کو مستقبل میں انسانیت کو دو مخالف گروہوں میں تقسیم ہوتا دیکھ کر حیران ہوتا ہے کیونکہ مستقبل میں جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے انسان نے جنگلوں میں نئی آبادیاں تخلیق کر لی ہیں لیکن ترقی یافتہ انسان انسانیت کی معراج سے اتنا گر جائے گا کہ وہ اپنی تہذیب و کلچر اور ماضی سے انحراف کرتا نظر آئے گا متن کا یہ جملہ "ماضی ایک ایسی لعنت ہے، جس سے ہم اپنے تئیں فرار ہو چکے ہیں" ماضی سے انحراف کی بہترین مثال ہے۔ (14) یعنی مصنف اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے قاری کو مستقبل کے خطرات سے آگاہ کر رہے جہاں انسان کو اپنے مفادات عزیز ہوں گے اور انسان تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود انسانیت کا ازلی دشمن بن جائے گا۔ ناول میں موجود ایک دانشور یہ کہتا ہے کہ علم میں آخر کیا ہے، جو انسان کو تباہی کی طرف تک لے جاتا ہے، انسان کو شیطانوں میں بدل دیتا ہے اور وہ نسلی امتیاز، نسل کشی، منظم قتل، عام اور عالمگیری تباہی و بربادی کرنے لگتے ہیں۔ (15) یعنی کہ انسان کا مکانی پھیلاؤ ہو رہا ہے اور روحانی طور زوال پذیر ہے کیونکہ جنگلات کی کٹائی اور بگڑتے ہوئے ماحولیاتی عدم توازن کے سبب مستقبل میں پانی کے ذخائر کی قلت کے باعث جنگیں لڑی جائیں گی اور یہ مسائل مغربی ممالک سے زیادہ ایشیائی ممالک میں درپیش ہوں گے۔ ناول نگار نے اس حصے میں مستقبل کے حوالے سے جن خدشات کا اظہار کیا ہے وہ کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں لیکن ہمارے ملک میں ان خدشات کے پیش نظر کوئی حکمت عملی نظر نہیں آتی ہے۔

مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو ناول میں تاریخی واقعات کی بازیافت بھی ہے، مستقبل کی پیش بینی بھی ہے، عصری سماجی شعور بھی ہے اور عصرِ حاضر کے حالات و واقعات کی بازیافت بھی ہے اس لیے ہم یہ رائے دے سکتے ہیں کہ یہ ناول بیک وقت کئی زمانوں پر محیط ہو کر اپنے اندر کئی صدیاں سمویا ہوا ہے۔ اس ناول کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ ہر حصے کا اسلوب، زبان و بیان مختلف ہے۔ اس کے باوجود ہر حصہ لڑی میں دانوں کی طرح جڑ کر اپنے قاری کو چند سو صفحات میں قدیم ماضی سے حال اور مستقبل کی سیر کرا دیتے ہیں۔ ناول نگار اپنے گہرے مشاہدے اور فنی مہارت سے ناول کے پانچ حصوں میں چھ تہذیبوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلتا ہے، جس سے قاری بیک وقت تخیلاتی دنیا میں ماضی حال اور مستقبل کی سیر کرتا ہے۔ اسامہ صدیق کے انگریزی میں لکھے ناول کا اردو ترجمہ بھی تخلیقیت سے بھرپور ہے۔ دورانِ مطالعہ کہیں بھی جھول محسوس نہیں ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ "چاند کو گل کریں تو ہم جانیں" ادب میں دقیع اور گراں قدر اضافہ ہے تو غلط نہ ہو گا

حوالہ جات

1۔ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، "اردو میں تاریخی ناول"، لاہور: ابلاغ پبلشرز، 1994ء، ص: 16،17
2۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، "جدید اردو ناول" مشمولہ آج کا اردو ادب، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1979ء، ص: 170
3۔ فیض احمد فیض، "نسخہ ہائے وفا"، لاہور: کاروانِ ادب، س ن، ص: 180
4۔ اسامہ صدیق، "چاند کو گل کریں تو ہم جانیں"، (مترجم): عاصم بخشی، جہلم: بک کارنر، 2021ء، ص: 170
5۔ ایضاً، ص: 192
6۔ ایضاً، ص: 159
7۔ حنا جمشید، "چاند کو گل کریں تو ہم جانیں" https://www.humsub.com.pk/521178/hina-jamshed-57/ تاریخ 13 جنوری 2024ء، وقت 11:10PM
8۔ اسامہ صدیق، "چاند کو گل کریں تو ہم جانیں"، ص: 155
9۔ ایضاً، ص: 433
10۔ ایضاً، ص: 234تا238
11۔ ایضاً، ص: 340
12۔ ایضاً، ص: 447
13۔ ایضاً، ص: 116
14۔ ایضاً، ص: 273
15۔ ایضاً، ص: 274